مباحثہ علمیہ حافظ محمد زبیر/محمد عمار ناصر

بیت المقدس کے شرعی حق دار مسلمان ہیں یا یہود؟

حلقہ اشراق سے خط وکتابت کا سلسلہ

المورد کے اسسٹنٹ فیلو جناب محمد عمار خان ناصر کی طرف سے ماہنامہ 'اشراق' جولائی واگست ۲۰۰۳ء میں 'مسجدِ اقصیٰ، یہود اور اُمتِ مسلمہ' کے عنوان سے ایک طویل مضمون شائع ہوا۔ چونکہ محترم عمار صاحب نے اپنے اس مضمون میں اُمتِ مسلمہ کے عام موقف کے بالکل برعکس ایک نئی رائے کا اظہار کیا تھا، اس لیے کئی علمی حلقوں کی طرف سے ان کو مختلف قسم کی علمی اور جذباتی تنقیدی آرا کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ عمار صاحب نے ماہنامہ 'اشراق' مئی و جولائی ۲۰۰۴ء کے شماروں میں ان تمام تنقیدی آرا کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ عمار صاحب کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

''مسجد اقصیٰ کی تولیت کا اخلاقی اور شرعی حق یہود کو حاصل ہے، اگرچہ تکوینی طور پر یہ مسجد سینکڑوں سال سے مسلمانوں کی تولیت میں ہے۔ یا بقولِ دیگر مسجد اقصیٰ کی تولیت کا شرعی حق تو یہود کا ہے جبکہ قانونی حق مسلمانوں کا ہے۔ محترم عمار صاحب کے بقول مسجد اقصیٰ یعنی ہیکل سلیمانی کو حضرت سلیمانؑ نے اپنے زمانے میں جنات سے تعمیر کروایا تھا۔ یہ یہودیوں کا قبلہ، مرکزی عبادت گاہ، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے ایک مرکز و مرجع تھا، اس لیے مسجد اقصیٰ ایک یہودی عبادت گاہ ہونے کی وجہ یہودیوں کا حق ہے۔ عمار صاحب کا یہ مضمون اکثر و بیشتر اُن علما کے استدلالات کی تردید پر مشتمل تھا جو کہ مسجد اقصیٰ کو یہود کا قبلہ، مرکزی عبادت گاہ، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے ایک مرکز و مرجع تو مانتے ہیں لیکن مسجد کے حق تولیت کو یہود کے حق میں منسوخ مانتے ہیں۔''

عمار صاحب کے اس مضمون کے جواب میں راقم الحروف نے ایک ناقدانہ مضمون لکھا جو ماہنامہ 'اشراق' کے اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے اور ماہنامہ 'الشریعہ' اور ماہنامہ 'میثاق' کے مارچ

www.KitaboSunnat.com

۲۰۰۷ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ راقم الحروف کے اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا:

''اپنے اس مضمون میں ہم نے مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے حق تولیت کے حوالے سے دو نکات کا تذکرہ کیا تھا: ① مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا سابقہ قبلہ ہے ② یہ بیت اللہ کی طرح شروع ہی سے ملتِ اسلامیہ کی ایک عبادت گاہ کے طور پر چلی آ رہی ہے۔ یہ تو ہمارا مثبت استدلال تھا۔ دوسرا ہم نے اپنے اس مضمون میں یہ کہا تھا کہ عمار صاحب کے پاس قرآن وسنت سے کوئی ایک بھی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس سے وہ یہ ثابت کرسکیں کہ مسجد اقصیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہود کا قبلہ، مرکزی عبادت گاہ، قربان گاہ یا دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لئے مرکز و مرجع مقرر کیا ہو۔ بلکہ ہم نے قرآن وسنت سے ایسے بہت سے دلائل اپنے اس مضمون میں اکٹھے کر دیے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہود ونصاریٰ کا مسجد اقصیٰ کو اپنا قبلہ قرار دینا ان کے دین میں بدعت اور نئی اختراع ہے۔ مسجد اقصیٰ کی تولیت پر یہود کے شرعی حق کی کل دلیل عمار صاحب کے نزدیک وہ اسرائیلیات ہیں جن کو وہ کتابِ مقدس کے بیانات کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مسجدِ اقصیٰ کا یہودیوں کا قبلہ، مرکزی عبادت گاہ، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کیلئے ایک مرکز ومرجع ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہی نہیں ہے۔ اسلئے یہود کے حق تولیت کے تنسیخ کی کوئی بحث ہی نہیں پیدا ہوتی جس کے حق یا مخالفت میں کوئی بحث کی جائے۔''

ہمارے اس مضمون کے جواب میں محترم عمار صاحب کا تعاقب ماہنامہ 'اشراق' کے اپریل ۲۰۰۷ء اور 'الشریعہ' کے مارچ ۲۰۰۷ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ عمار صاحب کے اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا:

''عمار صاحب نے اپنے اس مضمون میں اپنے موقف کو دہرایا۔ علاوہ ازیں میرے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے اُنہوں نے پانچ نکات پر بحث کی اور یہ پانچوں نکات ایسے تھے جو میرے مضمون کی ضمنی ابحاث تھیں۔ اور مضمون کی اصل بحث 'کہ مسجد اقصیٰ پر یہود کے حق تولیت کی عمار صاحب کے پاس قرآن وسنت سے کیا دلیل ہے؟ کو اُنہوں بالکل نظرانداز کر دیا اور اپنے اس مضمون میں بھی اُنہوں نے اپنے اس موقف کہ 'مسجد اقصیٰ یہودیوں کا قبلہ، مرکزی عبادت گاہ، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے ایک مرکز و مرجع ہے، کی تائید میں قرآن وسنت سے کوئی دلیل نہیں دی۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے مضمون میں 'مسجد اقصیٰ کا اللہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرف سے یہود کے لئے قبلہ مقرر نہ کیے جانے اور بیت اللہ کا ہی یہود کا اصل قبلہ ہونے پر، جن قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ سے اثبات کیا تھا، ان آیات اور احادیث کا بھی اُنہوں نے اپنے اس مضمون میں کوئی جواب نہیں دیا۔''

عمار صاحب کے اس مضمون کی اشاعت پر میں نے ان کو ایک خط بذریعہ ای میل ۲۲/مارچ کو بھیجا لیکن اُنہوں نے اس خط کو ماہنامہ 'الشریعہ' کے اپریل کے شمارے میں شائع نہیں کیا بلکہ الشریعہ کے منظر عام پر آجانے کے بعد ۲/اپریل کو مجھے ایک خط بذریعہ ای میل بھیجا کہ جس میں اُنہوں نے الشریعہ میں میرے خط کو شائع نہ کرنے کی توجیہ پیش کی۔ اپنے اس خط میں عمار صاحب نے لکھا کہ اگر ''آپ چاہیں تو ہماری مراسلت ساتھ ہی ساتھ الشریعہ میں شائع ہوتی رہے گی۔'' عمار صاحب کا دو اپریل کے بعد جبکہ 'الشریعہ' کا تازہ شمارہ شائع ہو چکا تھا، یہ پیش کش کرنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

اُنہوں نے 'الشریعہ' کے اپریل کے شمارے میں میرے جوابی خط کو تو شائع نہ کیا لیکن مدیر محدث (حافظ حسن مدنی) کے ساتھ اس خط و کتابت کو شائع کیا جو 'محدث' کے ادارتی صفحات پر مشتمل مسجد اقصیٰ کے بارے میں ایک واقعاتی تجزیہ پر مبنی تھی جس کے پس منظر سے قارئین 'الشریعہ' آگاہ نہ تھے۔ حالانکہ مناسب تو یہ تھا کہ اگر عمار صاحب مسجد اقصیٰ کے حوالے سے شرعی موقف کی بحث کو آگے بڑھانا چاہتے تھے تو میرا خط شائع کرتے جسے نظر انداز کرتے ہوئے اُنہوں نے 'الشریعہ' ہی کے اپریل کے شمارے میں جہاد کے موضوع سے متعلق ایک مضمون کے تقریباً بارہ صفحات پر پھیلے ہوئے حواشی شائع کرنے کو ترجیح دی۔ اس طرزِ عمل کے مدنظر میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی خط و کتابت 'محدث' میں اشاعت کے لیے دوں۔

اس مختصر پس منظر کے بعد 'الشریعہ' کے شمارۂ مارچ اور 'اشراق' کے شمارۂ اپریل میں میرے مضمون کے جواب میں عمار خاں ناصر کے تبصرہ پر میرا جوابی مراسلہ ملاحظہ فرمائیے:

❶ محترم جناب محمد عمار خاں ناصر السلام علیکم!

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو میں آپ کا اس بات پر شکر گزار ہوں کہ آپ نے وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'مسجدِ اقصیٰ' کے حوالے سے میرے مضمون کو اپنے ماہنامہ میں نہ صرف جگہ دی بلکہ اس میں بعض ضمنی ابحاث کے حوالے سے کچھ قابل غور اور

www.KitaboSunnat.com

اصلاح طلب اُمور کی طرف توجہ بھی دلائی۔ آپ کی پیش کردہ تصریحات کی روشنی میں یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ بعض اُمور پر افہام وتفہیم کو آگے بڑھایا جائے۔ اس ضمن میں ہماری اوّلین گزارش یہ ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کے حوالے سے اپنے اس موقف کے حق میں کہ یہ یہود کی مرکزی عبادت گاہ، قبلہ، مقامِ قربانی اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے مقدس مقام اور روحانی مرجع ومرکز ہے، اگر آپ قرآن وسنت سے دلائل پیش کریں تو یہ بحث نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے، اس لیے کہ ہم نے بھی اپنے موقف کے دلائل قرآن وسنت ہی سے پیش کیے ہیں اور آئندہ بھی قرآن وسنت ہی سے پیش کریں گے۔ اِن شاء اللہ

اگر آپ کے پاس دلائل کے نام پر صرف اسرائیلیات ہی ہیں یا آپ کچھ ضمنی موضوعات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس بحث کو اسی جگہ ختم کردیں گے۔ مکرر عرض ہے کہ مزید افہام وتفہیم کی غرض سے یہ خط لکھ رہا ہوں، اُمید ہے آپ اس بحث کو مثبت انداز میں آگے بڑھائیں گے تاکہ آپ کا نقطہ نظر اور اس کے دلائل اچھی طرح واضح ہو جائیں۔ ذیل میں، میں اپنی رائے اور قرآن وسنت سے اس کے دلائل کو بیان کر رہا ہوں:

① میری رائے یہ ہے کہ مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کا سابقہ قبلہ ہے اور اس کی دلیل ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا...﴾ (البقرۃ:۱۴۳) ہے جبکہ اس بات کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو کسی بھی دور میں یہود کا قبلہ مقرر کیا ہو۔ آپ بیت المقدس کو یہود کا قبلہ تو کہتے ہیں لیکن اس کی کوئی دلیل آپ نے ابھی تک پیش نہیں کی جبکہ مسجدِ اقصیٰ کی تولیت کا حق مسلمانوں کو حاصل ہے، کیونکہ یہ ان کا سابقہ قبلہ اور خصوصی عبادت گاہ ہے، جبکہ یہود کا معاملہ ایسا نہیں ہے جب تک کہ کسی شرعی دلیل سے مسجدِ اقصیٰ ان کا قبلہ ثابت نہ ہو جائے۔

② دوسری بات یہ ہے کہ میری رائے کے مطابق مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی اہم عبادت گاہ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے ہی مسجدِ حرام کی طرح یہ بھی دین اسلام کی ایک عبادت گاہ کے طور پر معروف رہی ہے، جبکہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ

''یہ مسجد بنی اسرائیل کی عبادت گاہ، قربانی اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے مقدس مقام اور روحانی مرجع ومرکز ہے۔''

www.KitaboSunnat.com

آپ کے اس موقف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) پہلی بات تو یہ کہ آپ کے اس موقف کی بھی قرآن وسنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کسی دور میں بنی اسرائیل کے لیے قربانی اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے ایک مقدس مقام اور روحانی مرجع ومرکز رہی ہے، اگر اس موقف کی کوئی ایسی دلیل ہے تو آپ پیش کریں، اس پر غور ہوسکتا ہے۔ مزید برآں اس کی بھی وضاحت فرما دیں کہ آپ کے نزدیک 'دیگر عباداتی رسوم' سے کیا مراد ہے؟

(ب) جہاں تک آپ کے اس موقف کا تعلق ہے کہ مسجد اقصیٰ بنی اسرائیل کی عبادت گاہ ہے تو ہم یہ بات تو مانتے ہیں کہ ایک دور میں یہ بنی اسرائیل (اس دور کی ملتِ اسلامیہ) کی اہم عبادت گاہ رہی ہے، لیکن اس کی تعمیر پہلی مرتبہ بنو اسرائیل نے نہیں کی بلکہ یہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے مسجدِ حرام کی طرح دین 'اسلام' (تمام انبیاء ورسل کے دین) کی ایک معروف اور اہم عبادت گاہ کے طور پر چلی آ رہی ہے، اس لیے حضرت سلیمانؑ کی مسجد اقصیٰ کی صرف تجدید سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس پر صرف یہود کے شرعی حق کا دعویٰ کیا جائے۔ ہمارے نزدیک مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی اہم عبادت گاہ ہے اور اس کے درج ذیل دلائل ہیں:

پہلی دلیل: اگر تو یہ بات دلائل کی روشنی میں ثابت ہو جائے کہ مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر حضرت سلیمانؑ نے کی یا حضرت یعقوبؑ نے اس کی پہلی بنیاد رکھی تھی تو پھر تو یہ بات قابل بحث بنتی ہے کہ مسجد اقصیٰ پر یہود کا بھی شرعی حق ہے یا نہیں؟ لیکن اگر اس بات کے قوی دلائل موجود ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بھی مسجد اقصیٰ موجود تھی تو پھر ہمارے خیال میں یہ مسئلہ قابل بحث ہی نہیں بنتا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر وتاریخ کا تعین کرنے میں حضرت ابوذرؓ غفاریؓ کی درج ذیل روایت کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ فرماتے ہیں:

سألت رسول الله ﷺ عن أول مسجد وضع في الأرض قال: المسجد الحرام. قلت: ثم أي؟ قال المسجد الأقصى. قلت: كم بينهما؟ قال: أربعون عامًا (صحیح مسلم: کتاب المساجد، رقم ۵۲۰)

''میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ، اس روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی۔ آپ نے جواب دیا: مسجدِ حرام میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟

www.KitaboSunnat.com

تو آپ نے فرمایا: مسجدِ اقصیٰ، میں نے کہا: ان دونوں کی تعمیر کے دوران کل کتنا وقفہ ہے تو آپ نے کہا: چالیس سال۔''

اللہ کے رسول ﷺ کی صحیح حدیث کے مطابق سب سے پہلی مسجد جوروے زمین پر بنائی گئی، وہ مسجدِ حرام ہے جبکہ دوسری مسجد 'مسجدِ اقصیٰ' ہے اور ان دونوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے۔ہم نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھ رہے ہیں کہ اگر مسجد حرام کی پہلی تعمیر کو متعین کر دیا جائے تو مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا زمانہ واضح ہوجاتا ہے اور صحیح نصوص کے مطابق مسجد حرام کی پہلی تعمیر حضرت براہیمؑ سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس لیے حضرت سلیمانؑ یا حضرت یعقوبؑ کسی طرح بھی مسجدِ اقصیٰ کے مؤسس اوّل نہیں بنتے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ﴿رَبَّنَا إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ﴾ میں عند بيتك المحرم کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ بیت اللہ کی تعمیر اوّل حضرت ابراہیمؑ نے نہیں کی تھی۔صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی سرزمین میں چھوڑ کر جا رہے تھے تو اُنھوں نے اس وقت یہ دعا مانگی۔اس روایت کے الفاظ ہیں:

استقبل بوجهه البيت ثم دعا بهؤلاء الدعوات ورفع يديه فقال: ﴿رَبَّنَا إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ﴾

''حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا مانگی: اے میرے ربّ بے شک میں نے اپنی اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں ٹھہرایا ہے جو کہ کھیتی والی نہیں ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الانبیاء: رقم ۳۳۶۴)

اسی طرح قرآن کی آیت ﴿وَإِذۡ يَرۡفَعُ إِبۡرَٰهِـۧمُ ٱلۡقَوَاعِدَ مِنَ ٱلۡبَيۡتِ﴾ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے سے موجود بیت اللہ کی بنیادوں پر اس کی تعمیر کی تھی۔صحیح بخاری کی اسی روایت میں آگے یہ بھی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی سرزمین میں چھوڑ کر گئے تو اس وقت ایک فرشتے نے حضرت ہاجرہؑ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا:

فقال لها الملك لا تخافوا الضيعة فإن ههنا بيت الله يبني هذ الغلام وأبوه و إن الله لا يضيع أهله . وكان البيت مرتفعا من الأرض كالرابية

www.KitaboSunnat.com

تأتيه السيول فتأخذ عن يمينه وشماله (ایضاً)

''تو فرشتے نے حضرت ہاجرہؑ سے کہا کہ آپ ضائع ہونے سے نہ ڈریں کیونکہ اس جگہ بیت اللہ ہے جس کی یہ لڑکا اور اس کا والد تعمیر (نو) کریں گے۔ (حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا کہنا ہے کہ ان دنوں) بیت اللہ ٹیلے کی مانند زمین سے کچھ بلند تھا اور جب سیلاب وغیرہ آتا تھا تو وہ بیت اللہ کے دائیں اور بائیں جانب سے نکل جاتا تھا۔''

مزید برآں مسجد حرام کی حضرت ابراہیمؑ سے پہلے تعمیر کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کے لیے نماز کو مشروع قرار دیا تھا جس کے لیے ایک قبلہ کا ہونا ضروری تھا، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ حضرت آدم اور ان کے بعد انبیا کے دین میں نماز کا مشروع ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کے لیے حضرت آدمؑ کوئی قبلہ بھی تعمیر کریں۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیمؑ سے پہلے مختلف انبیا کے ہاں حج کا تصور بھی اس بات کو مستلزم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ایک قبلے کا وجود مانا جائے۔

جہاں تک یہود کے نام نہاد قبلہ (ہمارے بیت المقدس) کا تعلق ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر دور میں مقدس شخصیات اور بابرکت مقامات کے حوالے سے ہر مذہب کے لوگوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان شخصیات اور ان مقامات کی ان کی طرف خاص نسبت ہو، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے حوالے سے یہود، نصاریٰ اور مشرکین مکہ کا بھی مسلمانوں کی طرح یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ ان کے مذہب کے حامل تھے۔ لہٰذا جس قسم کا اختلاف حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے بارے میں ہوا، اسی قسم کا اختلاف مسجد اقصیٰ کے بارے میں بھی ہوا۔ مسجد اقصیٰ یہودیوں کی خصوصی عبادت گاہ نہیں ہے، اس کے بارے میں محترم عمار صاحب کو وہی دلیل دوں گا جو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے یہودی یا عیسائی نہ ہونے کے حوالے سے یہود و نصاریٰ کو دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَ مَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَ الإِنْجِيْلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهٖ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ مَا كَانَ إِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ

www.KitaboSunnat.com

الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (آلِ عمران:٦٥ تا ٦٧)

''اے اہل کتاب! کیوں تم حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔اور تورات وانجیل نہیں نازل کی گئی مگر حضرت ابراہیمؑ کے بعد، کیا پس تم عقل نہیں رکھتے؟ ہاں تم وہی لوگ ہو، تم نے جھگڑا کیا، اس بارے میں کہ جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم (دلیل) تھا (جیسے تورات وانجیل) پس کیوں تم جھگڑا کرتے ہو، اس بارے میں کہ جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم (دلیل) نہیں ہے (جیسے حضرت ابراہیمؑ)۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ حضرت ابراہیمؑ نہ ہی یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ وہ یکسو مسلمان تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔''

جناب عمار صاحب! آپ کس بنیاد پر مسجد اقصیٰ کو یہودی عبادت گاہ قرار دے رہے ہیں؟ حالانکہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر تو یہودی مذہب کی ابتدا سے ہزاروں سال پہلے ہو چکی تھی۔ چونکہ دلائل کی روشنی میں ثابت شدہ بات یہی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ہو چکی تھی اس لیے یہ یہودیوں کی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کی عبادت گاہ ہے۔

دوسری دلیل: مسجد اقصیٰ ان تین مساجد میں شامل ہے، جن کا تبرک حاصل کرنے کے لیے یا ان میں نماز پڑھنے کے لیے یا ان کی زیارت کے لیے سفر کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد: مسجدي هذا ومسجد الحرام ومسجد الأقصٰى (صحیح بخاری: کتاب الجمعۃ، رقم:١٣٩٧)

''تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کا قصد کر کے سفر کرنا جائز نہیں ہے، میری اس مسجد کا، یعنی مسجد نبویؐ کا، مسجدِ حرام کا اور مسجدِ اقصیٰ کا۔''

اسی طرح بعض صحیح احادیث میں بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی فضیلت ایک عام مسجد میں نماز پڑھنے سے دو سو پچاس گنا زیادہ بیان کی گئی ہے۔ اگر بیت المقدس یہودیوں کی عبادت گاہ اور قبلہ ہے تو وہاں نماز پڑھنے کی کیا تک بنتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا آخری طرزِ عمل یہ تھا کہ آپ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی یہودیوں کی مخالفت کرتے تھے چہ جائیکہ آپ مسلمانوں کو یہودیوں کی عبادت گاہ اور قبلے میں جا کر نماز پڑھنے کی ترغیب دلائیں۔ اسی طرح بعض صحیح احادیث کے مطابق مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننا جائز

www.KitaboSunnat.com

ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ آپؐ کے زمانے میں ایک یہودی عبادت گاہ میں نماز پڑھنے کی نذر ماننے کا کیا مطلب ہے؟ جبکہ وہ عبادت گاہ ابھی تک مسلمانوں کے قبضے میں بھی نہ آئی تھی۔ضعیف روایت کے مطابق جب بھی کوئی شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے آئے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر نکلے جیسے کہ اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔ایک یہودی عبادت گاہ میں نماز پڑھنے کی اتنی فضیلت کہ اس میں نماز پڑھنے کا ثواب مسجد حرام اور مسجد نبوی کے علاوہ مسلمانوں کی تمام دنیا کی مساجد سے بڑھ کر ہو، یہ بات ہمیں سمجھ میں نہیں آتی۔

عمار صاحب سے گزارش ہے کہ مسجد اقصیٰ کے حوالے سے صحیح احادیث میں وارد شدہ ایسے تمام فضائل کے بارے میں بھی اپنے نقطہ نظر کو واضح کریں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ان فضائل کو بیان کرنے کا مقصد کیا تھا؟

▣ میں جناب شیخ ابراہیم کا شکر گزار ہوں☆ کہ اُنہوں نے کچھ باتوں کی طرف توجہ دلائی:

① پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اُصولی طور پر جناب ابراہیم صاحب کی اس بات سے متفق ہوں کہ کسی شخصیت کے افکار ونظریات پر تنقید کرتے وقت اخلاقی اصولوں کی پاسداری کرنی چاہیے اور میری کوشش ہوگی کہ آئندہ اپنے مضامین میں اس سے بھی زیادہ محتاط اُسلوب اختیار کروں۔لیکن جناب ابراہیم صاحب سے بھی میں وہی گزارش کروں گا جو کہ میں نے طالب محسن صاحب سے کی تھی کہ تنقید کرتے وقت ان بنیادی اخلاقیات کا پاس جناب غامدی صاحب کو بھی کرنا چاہیے اور انہوں نے اپنی کتاب 'برہان' میں مذہبی جماعتوں کے قائدین، علما اور فقہا کے بارے میں تنقید کرتے وقت طنز وتضحیک کا جو اُسلوب اختیار کیا ہے یا تو ان حضرات سے معذرت کرتے ہوئے انہیں اس کا اِزالہ کرنا چاہیے یا پھر غامدی صاحب کو ایک نئی 'برہان'

☆ فروری ۲۰۰۷ء کے شمارہ 'الشریعہ' میں میرا ایک مضمون 'غامدی صاحب کا تصورِ فطرت' شائع ہوا تھا جس پر 'المورد' کے ریسرچ سکالر جناب شیخ محمد ابراہیم کا ایک تنقیدی خط مارچ کے شمارے میں شائع ہوا۔الشریعہ کو جو خط میں نے بھیجا، اس میں عمار صاحب کے مضمون کے جائزہ کے علاوہ شیخ محمد ابراہیم کے خط پر مختصر تبصرہ بھی شامل تھا۔مدیر 'الشریعہ' محمد عمار ناصر صاحب نے ابراہیم صاحب کے خط کے اس جواب کو بھی شمارۂ اپریل میں شائع نہ کیا اور ۲؍اپریل کو رسالہ شائع ہوجانے کے بعد مجھے یہ آفر کی کہ اگر میں چاہوں تو مئی کے شمارے میں یہ خط شائع کیا جاسکتا ہے۔جواباً میں نے اُنہیں الشریعہ کے مئی ۲۰۰۷ء کے شمارے میں یہ خط شائع کرنے سے منع کردیا اور اب یہ خط 'محدث' میں اشاعت کے لئے دیا جارہا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

تشکیل دینی چاہیے جو کہ اُن اخلاقی اُصولوں کے معیار پر پوری اُترتی ہو جس کی نصیحت ناصحین 'المورد' گاہے بگاہے غامدی صاحب کے ناقدین کو کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک غامدی صاحب کی 'برہان' موجود ہے، وہ انکے ناقدین کو 'غیر اخلاقی تنقید' کا جواز فراہم کرتی رہے گی۔

② دوسری بات جس کی طرف جناب ابراہیم صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ میں نے غامدی صاحب کے مآخذِ دین کو بیان کرتے وقت کوئی حوالہ نہیں دیا تو ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ میں نے غامدی صاحب کے مآخذِ دین بیان کرتے وقت ان کی کتاب 'میزان' اور ان کے رسالے 'اشراق' کا حوالہ دیا تھا۔ المورد کے ریسرچ اسکالر اور غامدی صاحب کے تلمیذِ خاص جناب منظور الحسن صاحب لکھتے ہیں:

''دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنتِ ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث اُستاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف 'میزان' کے صفحہ ۴۷ پر 'دین کی آخری کتاب' کے زیرعنوان ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔''

(ماہنامہ اشراق: مئی ۲۰۰۴ ص ۱۱)

'المورد' کے ریسرچ اسکالرز میرے اوپر تو تنقید کرتے ہیں کہ میں نے اپنی طرف سے غامدی صاحب کے مستقل مصادرِ شریعت دو کی بجائے چار بنا دیے حالانکہ سب سے پہلے جس نے اس بات کا انکشاف کیا کہ غامدی صاحب کے مصادرِ شریعت چار ہیں' وہ المورد کے ہی ایک ریسرچ سکالر' ماہنامہ 'اشراق' کے مدیر، غامدی صاحب کے تلمیذِ خاص ہیں۔ جناب منظور الحسن صاحب نے غامدی صاحب کی کتاب 'میزان' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مصادرِ شریعت چار ہیں جن کا تذکرہ اُستاذِ محترم نے اپنی کتاب 'میزان' کے صفحہ ۴۷ تا ۵۲ میں کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس دن غامدی صاحب نے 'میزان' کے یہ صفحات پڑھائے ہوں، اس دن جناب ابراہیم صاحب کلاس سے غیر حاضر ہوں، اور کچھ نہ سہی تو یہ بات تو بہرحال طے شدہ ہے کہ منظور الحسن صاحب، المورد میں جناب ابراہیم صاحب سے کافی سینئر (Senior) ہیں اور ماہنامہ 'اشراق' کے مدیر بھی ہیں۔ اس لیے غامدی صاحب کی کتاب 'میزان' کے بارے میں وہی بات معتبر ہونی چاہیے جو منظور الحسن صاحب، غامدی صاحب کا نام لے کر، ان کے رسالے میں کر رہے ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

ہم اُمید کرتے ہیں کہ غامدی صاحب مدیر'اشراق' کی تائید میں جناب ابراہیم صاحب کی فکری اصلاح کرتے ہوئے ماہنامہ'الشریعہ' کے صفحات میں ضرور کچھ لکھنا پسند کریں گے۔ اس کے برعکس اگر غامدی صاحب'الشریعہ' کے کسی آئندہ شمارے میں مدیر'اشراق' جناب منظور الحسن صاحب کی مبینہ علمی خیانت اور بہتان پر مشتمل 'اشراق' میں چھپنے والی مذکورہ بالا عبارت کی تردید فرما دیتے ہیں تو میں اپنے اس موقف کے بارے میں یہی کہوں گا کہ جو غلط فہمی جناب منظور الحسن صاحب کو غامدی صاحب کی طویل صحبت کے باوجود ہوئی، میں بھی اسی کا شکار ہوا ہوں لیکن پھر غامدی صاحب سے میرے سوالات کی نوعیت کچھ اور ہوگی۔

باقی رہی یہ بات کہ حدیث، اجماع یا مولانا امین احسن اصلاحی، غامدی صاحب کے مآخذ ِدین ہیں یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں آئندہ مستقل مضامین میں بحث ہوگی۔ ان شاء اللہ

③ تیسری بات یہ کہ میں نے 'الشریعہ' میں شائع شدہ 'تصورِ فطرت' کے مضمون میں جتنے بھی حوالے دیے ہیں، ان کو ان کے قائلین کی طرف منسوب کیا ہے۔ جناب ابراہیم صاحب کا یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ میں نے 'المورد' کے ریسرچ اسکالرز کے بعض فتاویٰ غامدی صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں۔ اگر کوئی عبارت غامدی صاحب کی تھی تو اس کی نسبت غامدی صاحب کی طرف کی گئی ہے اور اگر کوئی عبارت 'المورد' کے کسی ریسرچ اسکالر کی تھی تو اس کی نسبت اسی ریسرچ اسکالر کی طرف کی گئی ہے، مثلاً 'الشریعہ' میں شائع شدہ میرے اس مضمون کی دو عبارتیں ملاحظہ فرمائیں، ایک جگہ ایک عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''المورد کے ریسرچ اسکالر جناب منظور الحسن صاحب، غامدی صاحب کے مآخذِ دین کے بارے میں لکھتے ہیں۔''

ایک اور عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کا اندازہ المورد کے ایک ریسرچ اسکالر امیر عبد الباسط کے شراب سے متعلق ایک سوال کے جواب سے ہوتا ہے۔''

اس لیے جناب ابراہیم صاحب کا یہ اعتراض بجا نہیں کہ میں نے بعض آرا کی نسبت بلا تحقیق غامدی صاحب کی طرف کر دی بلکہ میں نے ہر رائے کی نسبت اس کے اصل قائل ہی کی طرف کی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

آخر میں جناب مدیر'الشریعہ' سے گزارش کروں گا کہ میں پہلے بھی اپنے ایڈریس کی تصحیح کروا چکا ہوں، اب دوبارہ کروا رہا ہوں کہ ۵۱ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور تو غامدی صاحب کے ادارے 'المورد' کا ایڈریس ہے جبکہ قرآن اکیڈمی کا ایڈریس ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ہے۔

والسلام حافظ محمد زبیر

۲۳/ مارچ ۲۰۰۷ء ریسرچ ایسوسی ایٹ 'قرآن اکیڈمی'

.....

محمد عمار خاں ناصر کا جواب

برادرِ مکرم حافظ محمد زبیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاجِ گرامی؟ آپ کا مکتوب موصول ہوا۔ بے حد شکریہ!

یہ بات میرے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہے کہ آپ مسجدِ اقصیٰ کی تولیت سے متعلق میرے نقطہ نظر کی تنقیح وتنقید کے سلسلے کو افہام وتفہیم کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے اس جذبے کا خیر مقدم کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ یہ سلسلۂ گفتگو اگر اسی جذبے کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو نفس مسئلہ کی تنقیح کے ساتھ ساتھ خود میرے لیے بھی رہنمائی اور اگر میرا نقطہ نظر غلط ہے تو اس کی اِصلاح کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ اللھم ارنا الحق حقا وارقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارقنا اجتنابہ!

آپ نے جو نکات پیش کیے ہیں، ان پر اپنی معروضات پیش کرنے سے قبل میں آپ کے نقطہ نظر کا بہتر فہم حاصل کرنے کے لیے حسبِ ذیل دو نکتوں کی وضاحت چاہوں گا:

① آپ نے فرمایا ہے کہ مسجد اقصیٰ کا بنی اسرائیل کے لیے مرکزی عبادت گاہ، قبلہ، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کے لیے مرکز مقرر کیا جانا قرآن وسنت سے ثبوت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وضاحت طلب نکتہ یہ ہے کہ آیا قرآن وسنت آپ کے نزدیک اصلاً دین وشریعت کا ماخذ ہیں یا اُنھیں تاریخ کا جامع ومانع ذخیرہ ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے؟ میری مراد یہ ہے کہ اگر تو مسجدِ اقصیٰ کے اُمتِ مسلمہ کے لیے عباداتی رسوم کا مرکز مقرر کیے جانے کا مسئلہ زیر بحث ہو تو یقیناً اس کے لیے قرآن وسنت ہی کی تصریح درکار ہوگی، لیکن یہ بات کہ اس مسجد کو بنی اسرائیل کی شریعت میں کیا مقام حاصل رہا ہے؟ میرے ناقص خیال میں

www.KitaboSunnat.com

شریعت کے بجائے تاریخ کا مسئلہ ہے اور اس کے لیے قرآن وسنت ہی سے ثبوت فراہم کرنے کی بات کم از کم میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ خود آپ نے حضرت آدمؑ کو بیت اللہ کا اوّلین مؤسس قرار دینے کے حق میں نہ صرف عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ایک ضعیف روایت جس کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا رجحان یہ ہے کہ وہ اسرائیلیات کی قبیل سے ہے اور ابن ہشام کی کتاب التیجان کے بیان سے استدلال کیا ہے بلکہ مختلف قیاسات سے بھی کام لیا ہے۔ ('الشریعۃ' مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۹ و ۱۰)

اسی طرح آپ نے بنی اسرائیل کے لیے خیمہ اجتماع کے قبلہ مقرر کیے جانے اور پھر اس کے صخرۂ بیت المقدس کے مقام پر رکھے جانے سے متعلق ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہما اللہ کے حوالے سے متعدد تاریخی واقعات ذکر کیے ہیں جن کا قرآن وسنت میں کوئی ذکر نہیں۔

('الشریعۃ' مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۱۶ و ۱۷)

پس اگر بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تاریخ کے بعض پہلوؤں سے متعلق اسماعیلیات بلکہ اسرائیلیات سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے تو دیگر تاریخی پہلوؤں کے بارے میں قرآن وسنت ہی میں کسی تصریح کا پایا جانا کیوں ضروری ہے اور اس معاملے میں بائبل کے بیانات کو آپ یکسر ناقابل اعتنا کیوں گردانتے ہیں؟ میرے ناقص فہم کے مطابق تفسیر وحدیث کے علما کے ہاں اسرائیلیات کا اطلاق یہود ونصاریٰ سے منقول ان روایات پر کیا جاتا ہے جن کی نوعیت اصلاً قصہ کہانیوں اور دیومالا کی ہے۔ ان روایات کی پشت پر بالعموم کوئی تاریخی ریکارڈ موجود نہیں، اس وجہ سے اُنھیں کوئی استناد بھی حاصل نہیں، لیکن بائبل کے صحائف پر اسرائیلیات کا اطلاق کر کے اُنھیں کلیتًا ناقابل اعتبار قرار دینے کا طریقہ ہمارے اہل علم اور بالخصوص بائبل سے براہِ راست واقفیت رکھنے والے علما نے اختیار نہیں کیا بلکہ وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ضمن میں عام طور پر ان صحائف سے پوری پوری مدد لیتے رہے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بائبل کو اُصولی طور پر ایک قابل اعتنا ماخذ ماننے کے بعد اگر اس کا کوئی بیان قرآن وسنت سے یا تاریخی قرائن وشواہد سے ٹکراتا ہو تو اس کو ردّ کر دینے میں کسی کو بھی کوئی تردّد نہیں ہوگا۔ مسجد اقصیٰ کے معاملے میں بائبل کے مختلف بیانات کی نوعیت کیا ہے، اس پر ہم اپنے سلسلہ گفتگو میں آگے چل کر بحث کر سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر میں متعین

www.KitaboSunnat.com

طور پر صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ زیر بحث نکتے کو 'شریعت' کے دائرے کی چیز سمجھتے ہیں یا تاریخ کے دائرے کی؟ پہلی صورت میں آپ کی رائے کی توضیح اور اس کے دلائل مطلوب ہوں گے، جبکہ دوسری صورت میں آپ کو میرے مذکورہ سوال کا جواب عنایت فرمانا ہوگا۔

② آپ نے فرمایا ہے کہ ''اگر تو یہ بات دلائل کی روشنی میں ثابت ہو جائے کہ مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر حضرت سلیمانؑ نے کی یا حضرت یعقوبؑ نے اس کی پہلی بنیاد رکھی تھی تو پھر تو یہ بات قابل بحث ہے کہ مسجد اقصیٰ پر یہود کا شرعی حق ہے یا نہیں؟ لیکن اگر اس بات کے قوی دلائل موجود ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بھی مسجد اقصیٰ موجود تھی تو پھر ہمارے خیال میں یہ مسئلہ قابل بحث ہی نہیں بنتا۔''

میں زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنا چاہوں گا کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں آپ کے نزدیک فرق کہاں سے واقع ہوتا ہے؟ یعنی حضرت یعقوب یا حضرت سلیمان کے مسجد اقصیٰ کا بانی ہونے کی صورت میں وہ کون سا نکتہ ہے جو بنی اسرائیل کے حق تولیت کو کم از کم 'قابل بحث' ضرور بنا دیتا ہے؟ مزید یہ کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ مسجد اقصیٰ کی تاسیس تو پہلے کسی دور میں ہوئی تھی لیکن تاریخ کے ایک خاص مرحلے میں اسے بنی اسرائیل کی ایک مرکزی عبادت گاہ قرار دیتے ہوئے اسے ان کی تولیت میں دے دیا گیا تھا تو کیا اس صورت میں بھی آپ کے نزدیک ان کا حق تولیت 'قابل بحث' بنتا ہے یا نہیں؟ اثبات یا نفی، دونوں صورتوں میں اُمید ہے کہ آپ اپنی رائے کی دلیل بھی بیان فرمائیں گے۔

قرآن اکادمی کے دیگر رفقا کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

۲/اپریل ۲۰۰۷ء محمد عمار خان ناصر

نوٹ: ① اگر آپ چاہیں تو ہماری مراسلت ساتھ ہی ساتھ 'الشریعہ' میں شائع ہوتی رہے گی، البتہ میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ یہ بحث اجزا اور اقساط میں سامنے آنے کے بجائے پہلے ہمارے مابین پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور اس کے بعد مکمل صورت میں یکجا شائع ہو۔ اگر آپ اس سے اتفاق فرماتے ہیں تو ازراہِ کرم اپنی تحریر میں سے حافظ ابراہیم صاحب کے خط سے متعلق حصے کو الگ کر دیں تاکہ اسے 'الشریعہ' کی مئی کی اشاعت میں شائع کیا جا سکے۔ ② میں جمعرات کو لاہور آتا ہوں۔ اگر آپ ۳ سے ۵ بجے کے درمیان اکادمی میں موجود ہوں اور کچھ وقت فارغ کر سکیں تو میں ملاقات کے لیے حاضر ہونا چاہوں گا۔

www.KitaboSunnat.com

حافظ محمد زبیر کا جواب الجواب

محترم جناب عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم! اُمید ہے، مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کے مکتوبِ گرامی میں جن دو نکات کے بارے میں مجھ سے وضاحت مانگی گئی ہے اس سلسلے میں قرآن وسنت کے بارے میں دین وشریعت کا ماخذ ہونا یا تاریخ کا جامع مانع ذخیرہ ہونے کا سوال آپ نے اُٹھایا ہے۔گویا کہ آپ قرآن وسنت کو دین وشریعت اور اسرائیلیات یا بائبل وغیرہ کو تاریخی کتاب قرار دینے کی بنیاد پر یہ سوال اُٹھا رہے ہیں۔حالانکہ بلاشبہ قرآن وسنت ہی بنیادی طور پر دین وشریعت کا بیان ہیں لیکن دین وشریعت کو بیان کرنے کے لیے بہت دفعہ ان کا انداز واقعاتی ہوتا ہے، کیونکہ واقعات کے پس منظر میں دین وشریعت کو بیان کرنے سے بات زیادہ مؤثر رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ (سنتِ رسولؐ) کا غالب حصہ تو واقعاتی ہے۔اس لیے سابقہ تاریخ وسیر کی جانچ پڑتال کو قرآن وسنت سے باہر نہیں رکھا جا سکتا جبکہ سابقہ الہامی کتابوں میں بیان شدہ جن واقعات کو قرآن وسنت نے بھی بیان کیا ہے، ان واقعات کی حقیقت وہی ہے جو ہماری شریعت میں ہے کیونکہ اللہ کی کتاب (قرآن وسنت) پہلی شریعتوں کی مُھیمن (نگہبان) بھی ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے میرے حوالے سے بعض معروف اہل علم کے ان استشہادات کا ذکر کیا ہے جنہیں میں اپنے مقالہ میں اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کر چکا ہوں، بالخصوص آپ نے حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کی ایک ضعیف روایت کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں آپ کے بقول حافظ ابن کثیرؒ کا رجحان یہ ہے کہ وہ اسرائیلیات کی قبیل سے ہے۔اپنے اس استشہاد کی وجہ بیان کرنے سے پہلے میں اس سلسلے میں ضعیف احادیث اور سابقہ الہامی کتابوں کی روایات کے بارے میں اہل علم کا موقف امام ابن تیمیہؒ کی ایک عبارت کے حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔

امام ابن تیمیہؒ ان جلیل القدر ائمہ کی عبارت کے حوالے سے جو مجھول حدیث (یعنی جو نہ صحیح ثابت ہو اور نہ اس کا جھوٹ ہونا معلوم ہو) کی روایت فضائل اعمال میں جائز سمجھتے

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ اس سلسلے میں ابن تیمیہؒ علما کا اجماع نقل کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ اس مجہول حدیث کی اصل صحیح شرعی دلیل سے معلوم ہو۔ علاوہ ازیں اسی مجہول روایت سے وجوب واستحباب جیسے شرعی احکام ثابت نہ کیے جا رہے ہوں اور اس مجہول حدیث کی مثال اسرائیلیات سے دیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

..... وهذا كالإسرائيليات يجوز أن يروٰى منها ما لم يعلم أنه كذب للترغيب والترهيب في ما علم أن الله أمر به في شرعنا ونهٰى عنه في شرعنا فأما أن يثبت شرعًا لنا بمجرد الإسرائيليات التي لم تثبت فهذا لايقوله عالم ولا كان أحمد بن حنبل ولا أمثاله من الأئمة يعتمدون على مثل هذه الأحاديث في الشريعة... (قاعدة جليلة فی التوسل والوسیلہ،ص۸۲)

''یہی صورت حال اسرائیلیات کی ہے کہ جب ان کا کذب معلوم نہ ہو تو ترغیب وترہیب کے لیے ان کی روایت جائز ہے اور یہ صرف اس وقت ہے جب کہ اس معاملے کا جائز یا ناجائز ہونا ہماری شریعت میں معلوم ہو۔ لیکن جہاں تک اس بات کا معاملہ ہے کہ مجرد اسرائیلیات سے ہمارے لیے کوئی شریعت ثابت کی جائے تو اس کا کوئی بھی عالم قائل نہیں ہے اور نہ ہی احمد بن حنبلؒ اور ان جیسے بڑے ائمہؒ شریعت کے بارے میں ایسی احادیث پر اعتماد کرتے ہیں۔''

آپ نے شریعت اور تاریخ کے تقابل میں ایک اچھوتی بات اور بھی پیش کی ہے وہ یہ کہ آپ بائبل کو اسرائیلیات سے علیحدہ کر کے اسرائیلیات صرف ان قصے کہانیوں اور دیومالائی قصوں کو قرار دیتے ہیں جس کی پشت پر کوئی تاریخی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اسرائیلیات کی اہل علم کے ہاں نہ یہ تعریف ہے اور نہ ایسی گری پڑی بے اصل کہاوتوں کی روایت ہی جائز ہے، کیونکہ علما کے نزدیک معروف صیغے سے صرف صحیح یا مستند☆ روایت ہی کی جا سکتی ہے۔ بائبل وغیرہ کی کوئی سند موجود نہ ہونے کی بنا پر یہ بلا شبہ غیر مستند ہیں اور ان کے محرف ہونے پر قرآنِ مجید بھی شاہد ہے۔ اسرائیلیات کی تعریف کے سلسلے میں محمد حسین الذہبی کی مشہور تالیف التفسیر والمفسرون (ج۱ص۱۶۵) کے حوالے سے ڈاکٹر محمد بن محمد ابوشہبہ نے خلاصہ اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے:

"ومن التوراة وشروحها والأسفار وما اشتملت عليه والتلمود وشروحه

www.KitaboSunnat.com

والأساطير والخرافات والأباطيل التي افتروها أو تناقلوها عن غيرهم كانت معارف اليهود وثقافتهم وهذه كلها كانت منابع ا لأصلية من إسرائيليات التى زخرت بها بعض كتب التفسير والتاريخ والقصص والمواعظ ... فمن ثم انجر ذلك إلى الإسرائيليات وقد يتوسع بعض الباحثين في الإسرائيليات فيجعلها شاملة لما كان من معارف اليهود وما كان من معارف النصارٰى التي تدور حول الأناجيل وشروحها والرسل وسيرهم ونحو ذلك فإنما سمّيت إسرائيليات لأن الغالب والكثير منها إنما هو من ثقافة بني إسرائيل أو من كتبهم ومعارفهم أو من أساطيرهم وأباطيلهم . (الإسرائيليات والموضوعات في كتب التفسير والتاريخ :ص۱۳،۱۴)

''تورات،اس کی شروح، اسفار اور جن پر وہ مشتمل ہیں؛تلمو د اور اس کی شروح،کہانیاں اور دیو مالائی قصے اور بے اصل باتیں جنہیں اُنہوں نے گھڑ لیا تھا اور افواہیں؛یہی اصل میں یہودی علوم اوران کی ثقافت ہے اور یہ سب کچھ ان اسرائیلیات کے ماخذ اور سرچشمے ہیں جن سے بعض تفسیر،تاریخ،قصوں اور وعظ ونصیحت کی کتابیں سنواری گئی ہیں؛تب سے ان پر اسرائیلیات کا لفظ جاری ہوگیا۔بعض محققین اسرائیلیات میں وسعت پیدا کرتے ہوئے یہودی علوم وفنون کے علاوہ اس میں وہ تمام عیسائی علمی ذخیرہ بھی شامل کرتے ہیں جو انجیلوں ،ان کی شروح، رسولوں اور ان کی سیرتوں وغیرہ پر مشتمل ہے کیونکہ ان چیزوں کا بڑا حصہ بنی اسرائیل کی ثقافت ہی ہے جو انہی کی کتابوں،علوم ومعارف،کہانیوں اور بے بنیاد قصوں سے لیا گیا ہے۔''

جہاں تک میرے اوپر آپ کے الزام کا تعلق ہے کہ میں بھی ضعیف روایات یا اسرائیلیات سے استدلال کرتا ہوں تو یہ بات درست نہیں ہے بلکہ میرے اصل دلائل قرآن وسنت ہیں۔ البتہ قرآن وسنت سے استدلال کرتے ہوئے میں اگر کہیں اسرائیلیات یا ضعیف روایات سے اُنہیں تائید دیتا ہوں تو یہ علمی اصطلاح میں 'استشہاد' کہلاتا ہے ۔علاوہ ازیں اہل علم کی آرا میرے لیے مزید اطمینان کا باعث ہوتی ہیں گویا میرا انداز مسلمانوں کا مسلمہ طریق تحقیق ہے جب کہ آپ کا موقف صرف اسرائیلیات پر مبنی ہے۔ہم شروع سے ہی آپ سے یہ مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ اپنے موقف کی کوئی دلیل قرآن وسنت سے پیش کریں،لیکن آپ

www.KitaboSunnat.com

نے اپنے اس موقف 'کہ مسجد اقصیٰ بنی اسرائیل کے لیے مرکزی عبادت گاہ، قبلہ، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کے لیے مرکز ومرجع ہے، کے اثبات میں تا حال قرآن وسنت سے کوئی ایک دلیل بھی نہیں دی۔ میں بصد احترام آپ سے ایک بار پھر وہی گزارش کروں گا جو کہ میں اپنی اصل تحریر اور اس کے بعد ایک خط میں بھی کر چکا ہوں کہ اپنے موقف کے اثبات میں کوئی ایک دلیل قرآن وسنت سے پیش کریں، ورنہ کم از کم یہ تو تسلیم کر لیں کہ آپ کے موقف کی کوئی دلیل قرآن وسنت میں نہیں ہے بلکہ آپ کے اصل دلائل وہ اسرائیلیات ہیں جس کو آپ کتاب مقدس کے بیانات کہتے ہیں۔

میرے پہلے خط کے حوالے سے آپ نے مجھ سے دو سوالات کا جواب طلب کیا ہے تاکہ میرے نقطہ نظر کا بہتر فہم آپ کو حاصل ہو سکے۔ ان سوالات کا جوب درج ذیل ہے:

① آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے ہمارے نزدیک 'مسجد اقصیٰ کا بنی اسرائیل کے لیے مرکزی عبادت گاہ ہونا' قبلہ ہونا' قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے مرکز ومرجع ہونا، امتِ مسلمہ کے لیے ایک شرعی مسئلہ ہے کیونکہ اس مفروضے کو ماننے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت، مسلمانوں کا شرعی حق نہیں ہے اور مسجد اقصیٰ کی تولیت پر مسلمانوں کا شرعی حق نہ ہونا، ملتِ اسلامیہ کی شریعت کا مسئلہ ہے جس کے لیے دلیل لازماً قرآن وسنت سے ہونی چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ 'مسجد اقصیٰ کا بنی اسرائیل کے لیے مرکزی عبادت گاہ ہونا، قبلہ ہونا، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے مرکز ومرجع ہونا، بنی اسرائیل کے لیے ایک شرعی مسئلہ تھا۔ ہماری نظر میں اُمت محمدیہ کے لیے یہ بحث شرائع من قبلنا کی ہے۔ اُصولِ فقہ کے ماہرین نے اُصول کی کتب میں شرائع من قبلنا کی چار اقسام بیان کی ہیں: جن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کسی واقعے یا مسئلے کا بیان پچھلی شریعتوں میں ہو اور قرآن وسنت میں اس کا کوئی تذکرہ نہ ہو تو علما اور فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس واقعے یا مسئلے سے کوئی شرعی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگر آپ اس بات کو ایک مجرد تاریخی واقعے کے طور پر بیان کرتے ہیں تو ہمارے خیال میں تصدیق وتکذیب کیے بغیر اس کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ زیر بحث تاریخی واقعہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن وسنت کی تائید کے بغیر ایک مفروضہ ہے جبکہ آپ اس تاریخی واقعے کو صحیح قرار دیتے ہیں بلکہ آپ کے نزدیک اس تاریخی واقعے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا مسجد اقصیٰ کی تولیت پر کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کا یہ استدلال اجماعاً غلط ہے۔

تیسری بات یہ کہ شرائع من قبلنا کی ایک قسم جس کا آپ نے بھی تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ''یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بائبل کو اُصولی طور پر ایک قابل اعتنا ماخذ ماننے کے بعد اگر اس کا کوئی بیان قرآن وسنت سے یا تاریخی قرائن وشواہد سے ٹکراتا ہو تو اس کو ردّ کردینے میں کسی کو بھی کوئی تردّد نہیں ہوگا۔'' ہمارے نزدیک آپ کے اس موقف 'مسجدِ اقصیٰ کا بنی اسرائیل کے لیے مرکزی عبادت گاہ ہونا، قبلہ ہونا، قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوم کی ادائیگی کے لیے مرکز ومرجع ہونا، کی تردید قرآن وسنت سے بھی ہوتی ہے اور ہم نے اس کے دلائل اپنے اصل مضمون میں دیے تھے۔ میں نے سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸ سے استدلال کیا تھا کہ یہود کا اصل قبلہ (یعنی مرکزی عبادت گاہ اور روحانی مرکز ومرجع) بیت اللہ ہی ہے۔ آپ نے ان آیات سے میرے استدلال کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔

علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ قرآن کی آیت واجعلوا بیوتکم قبلة کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد کعبة ہے۔ گویا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول کے مطابق بنی اسرائیل کا قبلہ کعبة ہے اور قبلہ ہی کسی مذہب کی مرکزی عبادت گاہ اور روحانی مرکز ومرجع ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول غیر اجتہادی اُمور سے متعلق ہے اور غیر اجتہادی اُمور میں کسی صحابی کا قول حدیثِ مرفوع حکمی کہلاتا ہے۔

اسی طرح ہم نے اپنے اصل مضمون میں صحیح احادیث کی روشنی میں یہ بھی ثابت کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے انبیا بیت اللہ کا حج کرنے کے لیے آتے تھے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت یونسؑ کے بارے میں صحیح روایات میں ملتا ہے اور خود آپ بھی اس بات کے قائل ہیں جیسا کہ ایک ملاقات کے دوران آپ نے اس بات کا اقرار کیا کہ بنی اسرائیل کے انبیا کا مقامِ حج 'بیت اللہ' ہی تھا۔ جب اولادِ ابراہیم کا مقام حج، بیت اللہ ہے تو اولادِ ابراہیمؑ کے لیے بیت اللہ ہی اصل قربان گاہ اور دیگر عباداتی رسوام کی ادائیگی کے لئے مرکز ومرجع بھی ہوا۔

www.KitaboSunnat.com

چوتھی بات یہ کہ ہمارے نزدیک 'مسجد اقصیٰ' مسجدِ نبوی کی طرح ایک اہم عبادت گاہ تو ہے لیکن یہ ان کا قبلہ نہیں ہے۔ اسی طرح نہ مرکزی قربان گاہ ہے اور نہ ہی دیگر عبادتی رسوم کی ادائیگی کے لیے کوئی مرکز و مرجع ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجدِ نبویؐ کی عام مساجد کے اعتبار سے خصوصی فضیلت یہ ہے کہ ان کی طرف زیارت کی نیت سے سفر جائز ہے جو فضائل و برکات کے اعتبار سے عام مساجد کی نسبت ان کی فضیلت و برتری کا ثبوت ہے۔ کیونکہ یہ دونوں مساجد انبیا کی تعمیر کردہ ہیں۔ علاوہ ازیں 'مسجدِ اقصیٰ' مسجدِ نبویؐ سے تاریخی اعتبار سے مقدم ہے لیکن فضائل اور برکات کے اعتبار سے کم ہے، البتہ مسجدِ اقصیٰ کا مسجد حرام سے تقابل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کی فضیلت مسجدِ اقصیٰ سے سینکڑوں مرتبہ زیادہ ہے۔

② دوسرا آپ کا سوال یہ تھا کہ ''حضرت یعقوب یا حضرت سلیمان کے مسجد اقصیٰ کے بانی ہونے کی صورت میں وہ کون سا نکتہ ہے جو بنی اسرائیل کے حق تولیت کو کم از کم قابل بحث ضرور بنا دیتا ہے۔''

آپ کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مسجد اقصیٰ کی تولیت کی علت دین اسلام ہے گویا یہ ملتِ اسلامیہ کی اہم عبادت گاہ ہے، نہ کہ بنی اسرائیل کا نسلی توارث۔ اگر تو یہ بات دلائل کی روشنی میں ثابت ہو جائے کہ حضرت یعقوبؑ یا حضرت سلیمانؑ نے پہلی مرتبہ مسجد اقصیٰ کو تعمیر کیا تھا تو پھر کم از کم یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کی علت کہیں نسلی توارث نہ ہو؟ لیکن قرآن وسنت اور قیاس صحیح کی روشنی میں یہی بات ثابت شدہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ہو چکی تھی جیسا کہ ہم اپنے اصل مضمون میں ثابت کر چکے ہیں اور آپ نے بھی اس کا ابھی تک انکار نہیں کیا۔ پس حضرت ابراہیمؑ سے پہلے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا ثابت ہونا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کی اصل علت دین اسلام ہے نہ کہ نسلی توارث، کیونکہ یہ ملتِ اسلامیہ کی عبادت گاہ ہے نہ کہ یہود کی۔ اسی طرح آیت مبارکہ ﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلاَةَ وَآتَى الزَّكَوةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللهَ﴾ (التوبہ:۱۸) میں بھی اس بات کا بیان ہے کہ کسی بھی مسجد کی تولیت کا بنیادی حق اس کو حاصل ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا ہے اور نماز

www.KitaboSunnat.com

قائم کرتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے۔ جس قوم کو اپنی نماز کا طریقہ بھی یاد نہ ہو، اس کو مسجد اقصیٰ دینے کا کیا مفہوم ہے؟ مسجد کی سب سے اہم عبادت نماز ہے اور یہودیوں کی کون سی نماز ہے جس کو وہ مسجد اقصیٰ کو حاصل کر کے ادا کریں گے؟

نص میں جس علت کا تذکرہ ہو، اس کی ایک قسم 'ایماء' کہلاتی ہے۔ 'ایماء' کی عام طور پر اُصولیین نے تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ کسی حکم کو اگر کسی وصف سے ملایا گیا تو وہ وصف اس حکم کی علت ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی مساجد کے آباد کرنے کے فوراً بعد کچھ اوصاف کا تذکرہ ہے جو کہ بطریق 'ایماء' اس حکم کی علت بن رہے ہیں اور یہ ایسی علت ہے جس کی خبر ہمیں نص نے دی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اُصولیین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب جمع کے صیغے کو اضافت کے ذریعے معرفہ بنایا جائے تو وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔☆ اس لیے مذکورہ بالا آیت میں مساجد اللہ کا لفظ عام ہے اور یہ بات بھی اتفاقی ہے کہ سبب نزول سے کسی عام کی تخصیص نہیں ہوسکتی کیونکہ شانِ نزول کسی امر کے سمجھنے میں معاون تو ہوتا ہے، علت نہیں ہوتا۔ اس قاعدے کو علما نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب اس لیے اس آیت کا سببِ نزول کچھ بھی ہو، ہم اس کی تخصیص نہیں کریں گے لہٰذا 'مساجداللہ' سے مراد صرف مسجدِ حرام نہیں ہوگی۔

اسی طرح حنفیہ کے نزدیک مختار مذہب یہی ہے کہ عام کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی ہوتی ہے جب تک کہ اس کی تخصیص نہ ہوئی ہو، اس لیے کسی عام کی پہلی تخصیص صرف اسی دلیل سے جائز ہے جو کہ خود قطعی الدلالہ ہو جبکہ آپ اس عام کی تخصیص قرآن کے سیاق وسباق سے کرتے ہیں۔ معذرتاً عرض ہے کہ جس کو آپ قرآن کا سیاق وسباق کہتے ہیں، وہ آپ کا ذاتی فہم ہے اور ذاتی فہم سے قرآن کے عام کی تخصیص نہیں ہوسکتی۔

اُمید ہے کہ آپ اس بار میری ان گزارشات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت سے اپنے موقف کے دلائل ضرور دیں گے یا پھر اپنی کتابِ مقدس کے ان مقامات کی نشاندہی ضرور کریں گے جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو یہود کا قبلہ اور مرکزی عبادت گاہ مقرر کیا تھا۔

☆ اصول الفقہ الاسلامی از ڈاکٹر وہبہ زحیلی: ص ۲۴۵، ۲۴۶

www.KitaboSunnat.com

محمد عمار ناصر کے پہلے تنقیدی مضمون کے پانچ نکات پر ہمارا تبصرہ

مسجد اقصیٰ کے بارے میں میری تحقیق وتنقید کے جواب میں ابھی تک ایک تو عمار صاحب کا مضمون ہے جو مارچ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا اور دوسرا اُن کا وہ خط ہے جس کا محدث کے سابقہ صفحات میں تذکرہ ہو چکا ہے اور اس کا مفصل جواب بھی ہم نے ساتھ ہی شائع کر دیا ہے۔ جہاں تک عمار صاحب کے پہلے تنقیدی مضمون کا معاملہ ہے تو وہ ۵/نکات پر مشتمل تھا۔

پہلے نکتے میں عمار صاحب نے ہم سے ایک سوال کیا تھا کہ مسجدِ اقصیٰ کی تاسیس کے حوالے سے موجود تین آرا میں ایک رائے کو اختیار کرنے کی ہمارے نزدیک کیا وجوہات ہیں؟ ہم نے ان کے اس سوال کا تفصیلی جواب علمی دلائل کے ساتھ 'محدث' کے سابقہ صفحات میں اپنے پہلے خط میں دے دیا ہے۔

عمار صاحب کا دوسرا نکتہ ایک عربی عبارت کے ترجمے کے حوالے سے ان پر ہماری طرف سے ہونے والی تنقید کے جواب میں تھا؛ یہ نکتہ ایک ضمنی بات پر مشتمل تھا۔ عمار صاحب کا تیسرا نکتہ ان کے ان نا مناسب بیانات کی وضاحت پر مشتمل تھا جو اُنہوں نے اپنے اصل مضمون میں علما پر تنقید کرتے ہوئے دیئے تھے۔ یہ نکتہ ہمارے مضمون کی اصل بحث سے ہٹ کر تھا۔ عمار صاحب کا چوتھا نکتہ جو کہ ہمارے نزدیک ان کے اس مضمون میں واحد علمی نکتہ تھا، جو اُن پانچ ضمنی نکات میں بھی علمی نکتہ صرف یہی تھا اور ابن قیم کی اس عبارت پر مشتمل تھا جو عمار صاحب نے ان کی تصنیف هداية الحيارى کے حوالے سے بیان کی تھی۔ میں نے اپنے اصل مضمون میں امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کا موقف بیان کرتے ہوئے کہ یہ حضرات مسجد اقصیٰ کو یہود کا اللہ کی طرف سے مقرر کردہ قبلہ نہیں مانتے، ان کی عربی عبارات بھی لکھیں تھیں لیکن جناب عمار صاحب نے جب 'الشریعۃ' میں میرا مضمون شائع کیا تو اس میں عربی عبارات کو حذف کر دیا جس کی وجہ سے عمار صاحب کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ

''ابن تیمیہ نے کعبہ کو حضرت ابراہیم اور ان سے پہلے کے انبیا کا قبلہ تو قرار دیا ہے لیکن ان کے بعد کے انبیا کے لیے کعبہ ہی کے 'قبلہ' ہونے کی، جیسا کہ فاضل ناقد کا اصرار ہے، نہ تو کوئی تصریح کی ہے اور نہ اشارہ''

www.KitaboSunnat.com

حالانکہ ابن تیمیہ کی عربی عبارت اس مسئلے میں اتنی واضح ہے کہ عربی زبان کے ابتدائی طالب علم کے لیے بھی شاید وہ کسی اُلجھن کا باعث نہ ہو۔امام صاحب لکھتے ہیں:

ولم يشرع الله مكانا يصلي إليه إلا الكعبة والأنبياء الخليل ومن قبله انما كانوا يصلون إلى الكعبة وموسى لم يكن يصلي إلى البيت المقدس بل قالوا: إنه كان ينصب قبة العهد إلى العرب ويصلى إليها في التيه

''اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے علاوہ کسی مقام کو بھی شریعتِ اسلامیہ میں نماز کے لیے جہت نہیں بنایا حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان سے ماقبل کے تمام انبیا کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور خود حضرت موسیٰ بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ خیمہ عہد کو عرب (یعنی بیت اللہ) کی طرف رخ کر کے نصب کرتے تھے۔''

ہمارا عمار صاحب سے سوال ہے کہ حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم سے پہلے تھے یا بعد میں تھے؟اور خط کشیدہ الفاظ کا کیا مفہوم ہے؟ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ امام صاحب کے اتنے واضح موقف پر عمار صاحب کو یہ اشکال کیوں پیدا ہو رہا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں:''امام صاحب کی عبارت میں نہ تو کوئی تصریح ہے اور نہ ہی کوئی اشارہ!''

دوسری بات یہ کہ انہوں نے امام ابن قیمؒ کے حوالے سے جو عبارت نقل کی ہے اس کو سمجھنے میں ان کو غلط فہمی ہوئی' اگر وہ اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی بجائے امامؒ صاحب کی دونوں کتابوں یعنی 'بدائع الفوائد' اور 'ہدایۃ الحیاری' کی عبارتوں کو سامنے رکھ کر امام صاحب کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو شاید ان کو 'ہدایۃ الحیاری' کی عبارت اپنے موقف کی تائید میں ہونے کا مغالطہ نہ ہوتا۔ امام صاحب کی کتاب 'بدائع الفوائد' کی عربی عبارت جس کو عمار صاحب نے ہمارے مضمون میں حذف کر دیا تھا، یہ ہے:

استقبال أهل الكتاب لقبلتهم لم يكن من جهة الوحي والتوقيف من الله بل كان عن مشورة منهم واجتهاد... أما قبلة اليهود فليس في التوراة الأمر باستقبال الصخرة البتة

''اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا اپنے اپنے قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا وحی کی

www.KitaboSunnat.com

رو سے یا اللہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اُنہوں نے اپنا قبلہ آپس کے مشورے اور اجتہاد سے مقرر کیا...(امام ابن قیم پہلے نصاریٰ کے قبلے کا ردّ کرتے ہوئے پھر یہود کی غلطی کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں) جہاں تک یہود کے قبلے کا تعلق ہے تو یہ بات تو واضح ہے کہ تورات میں کہیں بھی صخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔''

امام صاحب کی یہ عبارت بالکل واضح ہے اور جہاں تک 'ہدایۃ الحیاری' کی عبارت کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے:

وما صلى المسيح إلى الشرق قط وما صلى إلى أن توفاه الله إلا إلى بيت المقدس وهي قبلة داؤد والأنبياء قبله وقبلة بني اسرائيل

''اور حضرت عیسیٰ نے کبھی بھی مشرق کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھی۔ وہ اپنے آسمانوں پر اُٹھائے جانے تک بیت المقدس کو سامنے رکھتے ہوئے (بیت اللہ ہی کے رخ) نماز پڑھتے رہے جو حضرت داؤد کا اور حضرت مسیح سے پہلے آنے والے انبیا اور بنی اسرائیل کا (اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کے علاوہ ایک اضافی) قبلہ (نماز کی جہت) تھا۔''

ہم نے یہ مفہوم امام ابن قیمؒ کی دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں عبارتوں میں تطبیق کی صورت یہی ہے کہ یہود کا اصل قبلہ تو بیت اللہ تھا جبکہ اُنہوں نے اپنے مشورے اور رائے سے بیت المقدس کو بھی اپنا قبلہ بنا لیا تھا جیسا کہ 'بدائع الفوائد' کی عبارت میں وضاحت ہے۔ اور یہود کا مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنانے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جب صحرا میں بنی اسرائیل نماز پڑھتے وقت بیت اللہ کی طرف رخ کرتے تھے تو بطورِ تبرک لڑائی کی طرح تابوتِ سکینہ کو بھی اپنے سامنے رکھتے تھے۔ فلسطین میں بنی اسرائیل کی آمد کے بعد یہ تابوت تو صخرہ پر رکھ دیا گیا۔ اب بنی اسرائیل نے اپنی نمازوں میں بیت اللہ کی طرف رخ کرتے ہوئے صخرہ کو بھی سامنے رکھنا شروع کر دیا' ان کا صخرہ کو سامنے رکھنا اس پر موجود تابوتِ سکینہ سے تبرک حاصل کرنے اور حضرت موسیٰ کی تیہ (صحرا) میں سنت کو پورا کرنے کی غرض سے تھا، نہ کہ اس وجہ سے کہ اللہ نے صخرہ کو بنی اسرائیل کا قبلہ بنا دیا تھا۔ صخرہ سے تابوت کے غائب ہو جانے کے بعد آنے والے بنی اسرائیل بھی اپنی نمازوں میں سابقہ انبیاے بنی اسرائیل کی سنت کو پورا کرنے کے لیے بیت اللہ کے ساتھ ساتھ صخرہ (مسکن

www.KitaboSunnat.com

تابوت) کو بھی اپنی نمازوں میں سامنے رکھنے لگے۔

جبکہ 'ہدایۃ الحیاری' میں اپنی اس عبارت کے سیاق میں امام ابن قیمؒ عیسائیوں کا ردّ کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں کہ تم نے ہر مسئلے میں یہود کی مخالفت کی یہاں تک کہ تم نے قبلے کے معاملے میں یہود کی مخالفت کرتے ہوئے مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا حالانکہ انبیائے بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰ اپنی نمازوں میں بیت اللہ کی طرف رخ کرتے ہوئے صخرہ کو تو سامنے رکھتے تھے لیکن جہتِ مشرق کو اُنہوں نے کبھی بھی اپنا قبلہ نہیں بنایا۔ یہ ایک واقعاتی حقیقت ہے جس کی طرف امام ابن قیم اشارہ کر رہے ہیں، نہ کہ شرعی مسئلہ!

عمار صاحب کا پانچواں نکتہ 'الشریعۃ' ستمبر ۲۰۰۶ء میں غامدی کے تصورِ سنت پر شائع ہونے والے میرے ایک مضمون کی عبارت پر نقد تھا جس کا براہِ راست مسجدِ اقصیٰ کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ عمار صاحب نے اپنے مضمون میں جن پانچ نکات پر بحث کی تھی، ان میں سے تین کا تعلق تو اصل بحث سے بالکل ہی نہیں تھا جب کہ دو نکات کا تعلق اصل بحث سے ضمناً تھا جب کہ جو اصل موضوعِ بحث تھا یعنی قرآن وسنت سے عمار صاحب کا اپنے موقف کے حق میں کوئی ایک دلیل بھی نقل کرنا تو اس بارے میں ابھی تک عمار صاحب ہماری رہنمائی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں عمار صاحب نے اپنے مضمون میں إلی أن توفاہ اللہ کی عربی عبارت کا ترجمہ 'اپنے قبض کیے جانے تک' کیا ہے جس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ غامدی صاحب کی طرح آسمانوں پر حیاتِ مسیح کے مسلمہ عقیدے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ عمار صاحب کا اگر ایسا عقیدہ نہیں ہے تو اس کی اُنہیں وضاحت کرنی چاہیے تاکہ قارئین کو غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

حافظ محمد زبیر

ریسرچ ایسوسی ایٹ 'قرآن اکیڈمی' ۲۷/اپریل ۲۰۰۷ء

www.KitaboSunnat.com